وہ صفت پائی جاتی تھی جسے سرعت کہتے ہیں۔ ان سب علامتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کاروباری آدمی ہیں۔ ان مقاموں میں ان کو فقیر بہت کم ملے اور نہ کوئی مفلس سفید پوش نظر آیا۔ بخلاف اس کے امین آباد سے ہو کے جب مولوی گنج میں پہنچے ہیں تو ان کو بہت سے آدمی ایسے ملے جن کے ہاتھ میں بٹیروں کی کابک ہے۔ کوئی گنا چھیلتا چلا جاتا ہے۔ کوئی صاحب راستے میں کھڑے تانیں اڑا رہے ہیں۔ کوئی کسی پر پھبتی اڑا رہا ہے۔ دو چار کسی بازاری عورت سے سرِ راہ مذاق کر رہے ہیں۔ دو ایک بے فکرے کسی نیک بخت عورت کو نہیں معلوم کہاں سے گھیرے چلے آتے ہیں۔ وہ بیچاری ڈر کے مارے گھونگھٹ سے منہ چھپائے لیتی ہے۔ جلد جلد قدم اٹھائے چلی جاتی ہے۔ یہ ہیں کہ آوازے کس رہے ہیں۔ کہیں دو بے تکلف دوستوں میں گالی گلوچ ہو رہی ہے۔ کہیں دو آدمیوں میں مار پیٹ ہو رہی ہے۔ بہت سے آدمی جمع ہو گئے ہیں۔ کہیں بندر کا ناچ ہو رہا ہے۔ راستے میں اس قدر بھیڑ ہے کہ راستہ چلنا مشکل ہے۔ غرض کہ اکثر آدمی ایسے ہی تھے جن کے اطوار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو دنیا و مافیہا میں کوئی کام نہیں۔ محض نکمے ہیں۔ سوائے تمسخر اور تضیع اوقات انھیں کوئی بات کی فکر نہیں۔ بہت سے ایسے ملے جن کی صورت ہی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر غم کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ خدا جانے کے فاقے کڑاکے کے گذر چکے ہیں۔ ان گلی کوچوں میں فقیر بھی بہت سے ملے مگر رکاب گنج سے یحییٰ گنج کے پھاٹک تک جہاں دو طرفہ لوبیوں، کسیروں اور ٹھٹھیروں کی دکانوں میں بھی ایک قسم کی چہل پہل نظر آئی۔ اس بازار میں بے فکرے کم نظر پڑے۔ یحییٰ گنج کے پھاٹک سے سخاس تک اور وہاں سے ان کے مکان تک شہر کے بانکے ترچھے بد وضع لوگوں کا تو گویا رمنہ ہے۔ یہ تماشہ دیکھتے بھالتے

اپنے گھر پہونچے۔ کھانا پکا پکایا تیار رکھا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ بیوی
ٹوپی کاڑھ رہی تھیں۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی دسترخوان بچھا۔ میاں
بیوی، لڑکا، لڑکی سب نے ایک ساتھ مل کے کھایا۔ اب وقت قریب
گیارہ بجے کے تھا۔ اس وقت سے دوسرے دن صبح کو چھ بجے تک کوئی
کام اور نہ تھا۔ حساب سے انیس گھنٹے ہوئے۔ اگر ان میں سے سات گھنٹے
رات کے سونے کا حق نکال ڈالیں تو بھی گیارہ گھنٹے بچتے ہیں۔ نکمے اور
وقت کے فضول ضائع کرنے والے اس میں بہت سا وقت دن کو سو کے
کاٹ دیتے ہیں۔ مثلاً گیارہ بجے سے تین بجے تک۔ پھر تین بجے سے پانچ
بجے تک نہانے دھونے، بالوں میں کنگھی کرنے، تیل ڈالنے، مانگ
پٹیاں درست کرنے، کپڑے بدلنے میں بخوبی صرف ہو سکتے تھے۔ اس
کے بعد چوک کی سیر کو نکل جاتے۔ ادھر ادھر واہی تباہی میں پڑے پھرتے۔
اس طرح سات بج جاتے۔ اب کسی دوست کی ملاقات کا وقت آجاتا۔ وہاں
وہاں صرف باتیں کرنے میں یا کسی اور شغل مثلاً گنجیفہ، چوسر، شطرنج وغیرہ میں
تین چار گھنٹے بڑے لطف کے ساتھ بسر ہو سکتے تھے۔ ہمارے دوست مرزا
عابد حسین ایسے لوگوں میں نہ تھے۔ ان کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آذوقہ
کی فکر تھی۔ تقدیر کی بے جا شکایت نہ انھوں نے کسی کتاب میں پڑھی تھی اور نہ
ان کی تخئیل سے اختراع کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ یہ کسی فلک زدہ شاعر کی
صحبت میں کبھی نہیں بیٹھے تھے اور نہ انھوں نے کسی نجومی رمّال سے اپنے
دن دِکھوائے تھے۔ وقت کو کسی مفید کام میں صَرف کرنے کی دھن اُن
کے دل میں سمائی تھی۔ انھوں نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ وقت کا
ایک لمحہ سونے کے ریزوں کی طرح قیمتی ہے۔ ان کو ان ریزوں کے جمع

کرنے اور اس سے سونے کی تھکیا بنانے کی فکر تھی۔ مگر اس کی ترکیب انھیں نہیں آتی تھی۔ یہ مہندس کی طرح اس نسخہ کی فکر میں تھے مگر ابھی تک کوئی استاد کامل نہ ملا تھا۔ اب مجبوری نے سہارا دیا تھا کہ ہم یہ نسخہ بتا دیں گے۔

کھانا کھانے کے چند منٹ کے بعد انھوں نے اپنی تمام کتابیں جو انٹرنس اور نیچے درجوں میں جو پڑھی تھیں انھیں نکالا۔ ان میں سے سوائے تین کتابوں کے کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو سرے سے آخر تک ان کی کئی کئی مرتبہ کی پڑھی ہوئی نہ ہو۔ ان کتابوں میں سے ایک تو الجبرہ تھا جو صرف مساوات درجہ اول تک پڑھایا گیا تھا۔ اور نصف سے زیادہ ابھی پڑھنے کو باقی تھا۔ دوسری یوکلڈ (تحریر اقلیدس) جس کے صرف اول چار مقالے پڑھے تھے۔ پانچواں، چھٹا اور گیارہواں، بارھواں چھوٹ گیا تھا تیسرے مسورشین۔ اس میں صرف سطوح کا بیان دیکھا تھا۔ مجسمات سے بالکل ہی ناواقف تھے۔ یہ کتاب بھی نصف سے زیادہ پڑھنے کو باقی تھی۔ علم ریاضی سے ان کو خاص شوق تھا۔ ریاضی کے گھنٹہ میں اکثر ان ہی کے نمبر بڑھ جاتے تھے۔ ان سے اتر کے دیبی پرشاد تھا۔ اس نے انٹرنس پاس کر کے رڑکی کے داخلہ کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہوا۔ اب اوورسیر کلاس میں پڑھتا ہے۔ ڈیڑھ برس کے بعد پچھتر روپے کا ملازم ہو جائے گا۔

ان کتابوں کو پہلے تو انھوں نے حسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس خیال سے کہ ان کے پڑھنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ساتھ کے طالب علم اکثر ایف۔ اے کلاس میں پڑھتے ہیں۔ افسوس! اگر ممکن ہوتا تو ہم بھی پڑھتے وقت تو ہے۔ مادھو کو پڑھا کے ادھر ہی کالج چلے جایا کرتے تھے مگر فیس ادا کرنے کا مقدور ہے نہ کتابیں خرید سکتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی ہوتا تو اب

چھ مہینے سے زیادہ زمانہ گذر گیا۔ ساتھ والے کہاں سے کہاں پہنچے ہوں گے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ رڑکی کالج میں بھی داخلہ ناممکن ہے۔ اگر امتحان کے لیے تیاری کی اور پاس بھی ہو گئے مگر وظیفہ نہ ہوا تو اور صدمہ ہوگا۔ دوسرے اس کے امتحان کے لیے کسی قدر نقشہ کشی کی ضرورت ہے وہ کیونکر سیکھ سکتے ہیں۔ اس میں آلات کے بکس کی ضرورت ہے۔ غرض کہ مفلسی نے ہماری ترقی کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ کچھ بن نہیں پڑتا۔ کیا کیا جائے۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ بے کار بیٹھنا اچھا نہیں۔ اب تو آڈٹ آفس چلنا چاہیے۔

ایک بجے کے قریب آڈٹ آفس پہنچے۔ عرضی پر وہی معمولی جواب ملا (نو ویکینسی) کوئی جگہ خالی نہیں۔ اس جواب کے ملنے سے انھیں کچھ ایسا رنج نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اس کی توقع پہلے ہی سے تھی۔ دفتر سے باہر نکل کر یہ چلنے ہی کو تھے کہ رضا حسین ان کے اسکول کا ایک طالب علم جس نے چوتھے درجہ تک پڑھ کے چھوڑ دیا تھا، اس سے ملاقات ہو گئی۔

عابد حسین :۔ تم یہاں کہاں ؟

رضا حسین :۔ جی میں تو یہاں نوکر ہوں۔

عابد حسین :۔ کاہے میں نوکر ہو ؟

رضا حسین :۔ ٹریسروں میں۔

عابد حسین :۔ بھئی ٹریسر کسے کہتے ہیں ؟

رضا حسین :۔ نقشوں کا عکس اتارتا ہوں۔

عابد حسین :۔ کیونکر ؟

رضا حسین :۔ اے لیجیے۔ آپ کو آج تک یہی نہیں معلوم۔ چلیے دکھا دوں۔

رضا حسین ان کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ یہاں انھوں نے دیکھا کئی انجنی

اونچی میزیں لگی ہیں۔ ان پر نقشے بچھے ہوئے ہیں۔ ان پر ایک قسم کا باریک موم جامہ (جسے یہ پہلے کاغذ سمجھتے تھے) بچھا کر پیتل کی کیلوں سے جڑ دیا ہے جس سے نیچے جو کچھ بنا ہوا ہے، اوپر صاف نظر آتا ہے۔ اوزاروں کے بکس کھلے ہوئے رکھے ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے اور کچھ اونچی تپائیوں پر بیٹھے خط پر خط کھینچ رہے ہیں اور حرف پر حرف لکھ رہے ہیں۔ کوئی رنگ کی پیالیاں آگے رکھے رنگ دے رہا ہے۔ انھوں نے یہاں کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھا اور جو بات سمجھ میں نہ آئی اس کو ان لوگوں نے بڑی مہربانی سے بتایا۔ اتنے میں چپراسی نے کہا، صاحب آتے ہیں۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ میں دفتر سے باہر چلا جاؤں۔ ان لوگوں نے کہا کہ جی نہیں۔ صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ ٹھہر جائیں۔ ایک تپائی پاس رکھی تھی اس پر انھیں بٹھا دیا۔ صاحب دفتر میں آیا۔ سب لوگوں کا کام دیکھا۔ یہ ایک اجنبی آدمی تھے۔ ان سے دریافت کیا۔ آپ کون؟ یہ گھبرا سے گئے۔ رضا حسین نے جواب دیا۔ میرے پاس آتے ہیں۔ صاحب نے دریافت کیا ٹریسر کا کام جانتا ہے۔ رضا حسین نے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ اجی ابھی سیکھتے ہیں۔ صاحب تو دفتر سے چلے گئے۔

عابد حسین:۔ تم نے خوب کہی کہ سیکھتے ہیں۔

رضا حسین:۔ پھر اور کیا کہتا۔؟

عابد حسین:۔ اچھا تو اگر میں سچ مچ سیکھوں تو سکھا دو گے؟

رضا حسین:۔ میں تو کیا۔ مگر استاد نبی بخش سے کہو۔

استاد نبی بخش نقشہ نویس رڑکی کالج کے سند یافتہ پاس بیٹھے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے مذاق سے کہا۔

مگر حضرت مٹھائی دینا ہوگی۔

عابد حسین :۔ مٹھائی حاضر ہے مگر یہ تو بتائیے کتنے دنوں میں یہ کام آجائے گا ؟
نبی بخش :۔ یہ بھی اسی وقت بتا دیا جائے گا جب مٹھائی دیجئے گا۔
عابد حسین :۔ واقعی مذاق نہیں۔ میرا ارادہ اس کام کے سیکھنے کا ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو میں ممنون ہوں گا۔
نبی بخش :۔ میں بھی مذاق سے نہیں کہتا۔ عکس کشی تو کوئی چیز نہیں۔ اگر آپ سیکھنے کا قصد کریں تو نقشہ کشی سکھا دی جائے گی اور آپ تو انگریزی پڑھے ہیں۔ آپ کو بہت اچھی جگہ مل جائے گی۔
رضا حسین :۔ اچھا استاد تو پھر ہمارے مرزا صاحب کو سکھا دیجیے۔ بیچارے بے روزگار ہیں۔ کار سے لگ جائیں گے۔
نبی بخش :۔ (کسی قدر رد کھے ہو کے مگر مسکرا کے) بھئی تم جانتے ہو کہ میں بغیر مٹھائی کے تو سکھاتا نہیں۔
عابد حسین :۔ اچھا تو میں کل سے حاضر ہوں گا۔ مٹھائی لیتا آؤں گا۔
رضا حسین :۔ یہ کل کیوں ؟ کیا مٹھائی کے لیے دام نہیں ہیں ؟
عابد حسین کچھ چپ سے ہو گئے۔
رضا حسین :۔ (ایک روپیہ جیب سے نکال کے ایک چپراسی سے) اماں نوروز علی، ایک روپیہ کی مٹھائی تو لے آؤ۔ استاد بھی کیا کہیں گے کہ منہ میٹھا نہیں کیا۔ نوروز علی روپیہ لے کے گیا اور چند ہی منٹ کے بعد مٹھائی کی ٹوکری لے کے آگیا۔ جتنے عکس کش، چپراسی وغیرہ وہاں موجود تھے، سب میں دو چار ڈلیاں تقسیم ہو گئیں۔ عابد حسین نبی بخش نقشہ نویس کے شاگرد ہوئے۔
نبی بخش :۔ سنیے مرزا صاحب! عکس کشوں کی آج کل ہے ضرورت۔ صاحب

آپ کو دیکھ ہی چکے ہیں۔ آج کے آٹھویں دن آپ بیس روپے مہینے کے نوکر ہو جائیں گے۔ عکس کشی کوئی چیز نہیں ہے۔ رہی نقشہ نویسی اس کے لیے ایک عمر چاہیے۔ جتنی مجھے معلوم ہے اس کے بتانے میں دریغ نہ کروں گا باقی اگر آپ کو شوق ہوگا تو اپنے آپ سیکھتے رہیے گا۔ عابد حسین آٹھویں دن نوکر ہو جانے کی خوش خبری سن کے قریب تھا کہ شادیٔ مرگ ہو جائے۔ مگر وہ روپیہ جو رضا حسین نے ان کی طرف سے دے دیا تھا اس کی ادائیگی کی فکر نے کسی قدر ان کی مسرت کو بے لطف کر رکھا تھا۔ اتنے میں ایک ٹکڑا ٹریسنگ کلاتھ کا اٹھا کے نبی بخش نے ان کے سامنے رکھا اور ایک جدول قلم میں سیاہی بھر کے بتا دیا کہ اے لیجیے اس طرح سے خط کھینچیے۔ انھوں نے خط کشی شروع کی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے عرصے میں موٹے مہین خط ان کے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ اس اثنار میں نبی بخش نے ان کی انگریزی تحریر دیکھی۔ ان کا انگریزی خط بہت پاکیزہ تھا منشی نبی بخش نے چھاپے کے حروف لکھنے کا طریقہ بتا دیا اور ایک باریک قلم اور تھوڑا روی ٹریسنگ کلاتھ دیا کہ اس پر ان حرفوں کے لکھنے کی مشق کیجیے۔ چار بجے تک انھوں نے بڑی محنت سے کام کیا۔ جب دفتر برخاست ہوا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے یہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔

آج ان کو معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں نوکر ہو گیا۔ رضا حسین شاہ گنج کی طرف کے رہنے والے تھے۔ ان کا ساتھ بہت دور تک ہوا۔ راستہ میں باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ پانچ بجتے بجتے یہ گھر پہنچے۔

مرزا عابد حسین کو اپنی زندگی میں جس قدر کامیابیاں ہوئیں (جس کا حال اس کتاب کے ملاحظہ سے ہوگا) اس میں ان کی نیک بخت بیوی کی صلاحیت کو بڑا دخل تھا۔ ان میاں بیوی کے باہمی محبت کے اصول میں سے ایک یہ بات تھی کہ ایک کو دوسرے کی نیکی پر پورا بھروسہ تھا۔ میاں کے کاموں پر بیہودہ نکتہ چینی کرنا جو ایک عمدہ صفت ہمارے ملک کی عورتوں میں ہے، ان کی بیوی میں نہ تھی۔ بیوی میاں کی عزت کرتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ ان کو گھر کا خیال اور بچوں کی محبت اسی طرح ہے جس طرح مجھے ہے۔ عابد حسین میں رات دیر تک گھر سے غائب رہنے کی عادت نہ تھی۔ اگر حسن اتفاق سے کہیں دیر ہوتی تھی تو بیوی کو کسی قسم کی بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ اگر کہیں میاں کو دیر ہوگئی۔ اب گھر میں آئے تو بیوی نے مانا مت ڈال دی۔ قیامت برپا کی "نہیں تم رنڈی کے یہاں گئے تھے"۔ میاں اگر واقعی خطاوار ہیں تو خیر۔ اگر ناکردہ گناہ اس سرزنش کے مستوجب ٹھہرتے ہیں تو اب جز بز ہو رہے ہیں قسمیں کھاتے ہیں۔ قرآن اٹھاتے ہیں وہاں سماعت ہی نہیں۔

میاں :۔ بیوی تمہارے سر کی قسم مسجد سے نماز پڑھ کے مولوی صاحب قبلہ کے پاس گیا تھا۔ شکیات نماز میں کچھ دریافت کرنا تھا۔

بیوی :۔ وہ کون سا مولوی اجڈا ہے جو تمہیں نو نو بجے تک بٹھا رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہتے اپنی چہیتی کے یہاں گئے تھے۔ خدا غارت کرے موئی کو۔ ہیضہ کھائے۔ ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ زور سے ایک دوہتڑ زمین پر مارا۔ دیکھ لینا۔ ہوں اصل نسل کی سیدانی۔ موئی کو اٹھوارہ نہ گذریگا۔ کوس کوس کے کھا جاؤں گی۔

میاں :۔ یہ کس کو ؟

بیوی :۔ یہ اس کو جو تمہیں آدھی آدھی رات تک بٹھا رکھے۔

مفلسی کے زمانے میں بیوی کے زیور اور اسباب کو بیچ بیچ کر وہ جو اپنے باپ کے گھر سے لائی تھیں، بہت دنوں تک کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ چاندی کا ایک تار اور تانبے کا کٹورا تک باقی نہ رہا۔ اب تک بہت دنوں سے بیوی کی محنت کے ذریعے سے گھر کا کام چلتا تھا جس کا حال ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے مگر اس کا طعنہ کبھی میاں کو نہیں دیا۔ آج جب سرِ شام عابد حسین خوش خوش دفتر سے پھرے ہیں تو ان کو خیال تھا کہ بیوی سے کل حال بیان کر دونگا مگر پھر یہ خیال آیا کہ اب ایک ہی دفعہ بامراد کہیں گے جس دن نوکر ہو جائیں گے۔

رات کو انھوں نے نقشہ بنانے کی سیاہی ایک چھوٹی سی پیالی میں گھولی اور دس گیارہ بجے تک پرنٹ (نقشہ کے حروف) کی مشق کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح کو اٹھے۔ بلدیو مستری کے کارخانے گئے۔ نو بجے وہاں سے فراغت کر کے اُدھر ہی اُدھر ریل کے دفتر پہنچے۔ ابھی کوئی آیا بھی نہ تھا۔ یہ دفتر کے باہر ٹہلا کیے۔ جب سب آ گئے تو یہ بھی گئے۔ عکس کشی کی مشق کرنے لگے۔ آج صاحب نے پھر انھیں دیکھا مگر پوچھا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ پانچ ہی چار دن کے بعد یہ اچھی طرح ٹریس کرنا سیکھ گئے۔ دفتر میں ٹریسروں کی ضرورت پہلے ہی سے تھی۔ نبی بخش نے صاحب سے کہہ کے ان کا نام بھی لکھوا دیا۔ بیس روپے مہینے کے نوکر ہو گئے۔ مادھو کا پڑھانا بھی انھوں نے ترک نہیں کیا۔ اگرچہ بہت سخت محنت پڑتی تھی۔ اکثر ایک ہی وقت کھانا ملتا تھا مگر دنیا بہ امید قائم۔ پچیس روپے کا سہارا ہو گیا تھا اب انھیں کسی بات کا غم نہ تھا۔ بیوی بھی مطمئن ہو گئی تھیں مگر انھوں نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ آٹھویں دسویں ان کی ٹوپی بھی تیار ہو جاتی تھی اور میاں حسین علی بیچ لایا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک میاں حسین علی

نے ایک حبۂ حق السعی میں نہیں لیا مگر اب ایک آنہ روپیہ ان کا بھی مقرر ہو گیا۔
اس طرح تیس اتیس روپیہ میاں بیوی مل کے پیدا کر لیتے تھے۔
اگر کوئی شخص پست ہمت ہوتا تو وہ آئندہ اور کچھ ترقی نہ کرتا لیکن ہمارے
دوست مرزا عابد حسین میں نہ وہ وصف تھا جسے توکل کہتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو
بیوی کی چکن دوزی کے سہارے پر چارپائی کے بان توڑا کرتے۔ اور نہ وہ صفت
تھی جو قناعت کے نام سے مشہور ہے۔ ورنہ بلدیو کی پانچ روپے کی نوکری کافی
تھی۔ حیاتِ چند روزہ خوش و ناخوش گذر ہی جاتی۔ مگر زیادہ طلبی نے انکو چین
نہ لینے دیا۔ دوپہر کو گھڑی بھر سو رہنے تک کی مہلت نہ ہوئی۔ ریل کے دفتر میں
پہنچ گئے۔ خیر یہاں بیس روپے کی نوکری مل گئی مگر ان کی تقدیر میں اب بھی آرام نہ
تھا۔ عکس کشی سے نقشہ کشی سیکھنے کا شوق ہوا۔ ان کے استاد نبی بخش صاحب رڑکی
کالج کے پاس شدہ طالب علم تھے۔ انھوں نے یہ صلاح دی کہ اگر یہ کام اصول
سے سیکھنا ہے تو پہلے تحریر اقلیدس کا چھٹا مقالہ یاد کر لیجیے۔ اب رات کو یہ چھٹا
مقالہ یاد کرنے لگے۔ پہلے تو انھیں یہ خیال تھا کہ کہیں جا کے پڑھنا ہوگا۔ مگر غور
سے جو مطالعہ کیا آپ ہی آپ سمجھ میں آنے لگا۔ غرض کہ پورا چھٹا مقالہ مع پانچویں
مقالہ ان ضروری شکلوں کے جس کی چھٹے مقالہ میں ضرورت ہے، چند ہی روز میں
یاد کر لیا۔ اب منشی نبی بخش نے ان کو نقشہ کشی کے اصول ہندسے سکھانا شروع
کیا۔ دفتر میں کام سے فرصت نہ ملتی تھی۔ شام سے یہ منشی نبی بخش کے مکان پر پہنچتے
تھے۔ منشی نبی بخش بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ ان کو انگریزی پڑھنے کا شوق تھا۔
خلاصہ یہ کہ یہ انھیں انگریزی پڑھاتے تھے اور وہ انھیں نقشہ سکھاتے تھے۔
نقشہ کشی کے ساتھ ہی تخمینہ عمارات کے سیکھنے کا شوق ہوا۔ اس کے لیے
اقلیدس کا گیارہواں مقالہ اور علم مساحت مجسمات بھی حاصل کیا۔ چھ سات

مہینے میں یہ پورے نقشہ نویس اور اسٹیمیٹر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں منشی نبی بخش کو ایک مہینے کی رخصت کی ضرورت تھی۔ صاحب نے عوضی طلب کی۔ منشی نبی بخش نے انھیں پیش کر دیا۔ صاحب نے منظور کر لیا۔ اس زمانے میں انھیں اپنی کار گذاری دکھانے کا بہت عمدہ موقع ملا۔ صاحب ان کے کام سے بہت خوش ہوا مگر ابھی ایک بات کی ان میں کسر تھی۔ پیمایش کا کام یہ بالکل نہ جانتے تھے۔ نہیں تو اسی زمانے میں ان کو بہت اچھی نوکری مل گئی ہوتی۔ اب انھوں نے پیمایش کے سیکھنے کا تہیہ کر لیا۔

منشی نبی بخش کے آنے کے بعد انھیں پھر ٹرسیری کے کام پر جانا پڑا۔ دو مہینے کے بعد اب اس کام کی ضرورت دفتر میں نہ رہی تھی۔ سب ٹرسیر ایک دم سے تخفیف میں آ گئے۔ یہ بھی موقوف ہو گئے۔ مگر مہینے بھر منشی نبی بخش کی عوضی کرنے کی وجہ سے صاحب نے ان کو بہت عمدہ سارٹیفکٹ دیا۔ اب مرزا عابد حسین پھر وہی پانچ روپئے کے نوکر رہ گئے۔ اب نو بجے سے ان کو فرصت ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے سرویئنگ کا کام سیکھا۔ منشی نبی بخش کے ایک دوست منشی اللہ بخش صدر میں سب اوورسیر ہو کر آئے تھے۔ ان کو اکثر پیمایش کا کام رہتا ہے ان کے پاس جانے لگے۔ انھوں نے پرزمیٹک اور لیول کی پیمایش انھیں اچھی طرح سکھا دی۔

ایک دن کا واقعہ سنیے۔ ان کے محلے میں ایک صاحب میر کاظم علی نامی رہتے تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں مولوی، عالم کا امتحان دینے والے تھے۔ ان کے پاس یونیورسٹی کا کلنڈر رے کے آئے اور ضوابط امتحان کے قواعد ان سے پڑھوا کے ترجمہ کرائے۔ جاتے وقت بھولے سے کلنڈر چھوڑ کے چلے گئے۔ یہ ان کے جانے کے بعد اسے الٹ پلٹ کے دیکھنے لگے۔ خوش نصیبی سے ان کی نظر

اس جزو کتاب پر جا پڑی جس میں صیغۂ انجینیرنگ کے امتحانوں کا ذکر تھا۔ یہ اسے بڑے شوق سے پڑھنے لگے۔ تھوڑا سا ہی پڑھا تھا کہ مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ اس زمانے میں ان کے ایک دلی دوست سید جعفر حسین صاحب رڑکی کالج کے ایک پاس شدہ لائق طالب علم ملازم محکمۂ نہر رخصت پر آئے ہوئے تھے۔ مرزا عابد حسین نے فوراً کپڑے پہنے۔ کلنڈر لیے ہوئے شاہ گنج ان کے پاس پہنچے۔ سید صاحب کو آواز دی وہ گھر سے نکلے۔

سید صاحب :۔ خیریت تو ہے ؟

مرزا صاحب :۔ خیریت ہے۔ ذرا اسے دیکھیے گا۔ میرے لو حواس ٹھیک نہیں۔

سید صاحب :۔ (کلنڈر کو بڑے غور سے پڑھنے لگے۔ اب ان کے چہرے سے آثار مسرت کے ظاہر ہوئے) واقعی آپ امتحان دے سکتے ہیں۔

مرزا صاحب :۔ ذرا دیکھیے سن کی تو قید نہیں ہے۔ ؟

سید صاحب :۔ نہیں۔ سن کی تو قید نہیں ہے۔

مرزا صاحب :۔ اچھا تو اب دیکھیے مجھ کو کس کس چیز میں زیادہ محنت کرنا ہوگی۔

سید صاحب :۔ ریاضی، تحریر اقلیدس، مساحت یہ سب آپ جانتے ہیں انگریزی کی صرف انجینیرنگ کی اصطلاحات کی دو کتابیں جو رڑکی کالج میں چھپی ہیں انھیں دیکھ لیجیے۔ سرویئنگ، ڈرائنگ میرے نزدیک جتنا آپ نے سیکھا ہے کافی ہے۔ صرف ایک چیز سے آپ بالکل نابلد ہیں۔ انجینرنگ اس کی کتابیں میرے پاس موجود ہیں انھیں پڑھیے اور جہاں سمجھ میں نہ آئے میں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔

مرزا صاحب :۔ امتحان کب ہوگا ؟

سید صاحب :۔ (کلنڈر دیکھ کے) مئی میں۔ ابھی دن بہت ہیں۔ یا گست

کا مہینہ ہے۔ نو مہینے آپ کے لیے کافی ہیں۔ بسم اللہ کر کے محنت شروع کر دیجیے مگر سنیے تو آپ نے انٹرنس کہاں پاس کیا تھا؟

مرزا صاحب :۔ (ایک ذرا مشوش ہو کر) کلکتہ کا۔

سید صاحب :۔ (پھر کلنڈر دیکھ کے) سنڈیکیٹ کی خاص اجازت اور مہربانی سے ہر یونیورسٹی کا پاس شدہ لیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب :۔ (خوش ہو کے) تو اب سنڈیکیٹ کی اجازت کیونکر حاصل ہو؟

سید صاحب :۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک معمولی بات ہے۔ اچھا بہتر ہے۔ رجسٹرار کو ایک درخواست دے دیجیے۔

اسی وقت درخواست کا مسودہ لکھا گیا۔ سید جعفر حسین نے انجینیرنگ کی کتابیں لا کے حوالہ کیں۔ مرزا عابد حسین صاحب گھر آئے۔ فوراً درخواست کا مسودہ صاف کیا۔ لفافے میں بند کر کے ڈاک میں چھوڑ آئے۔ اس کے بعد احتیاطاً کلنڈر کی وہ تمام عبارت نقل کر کے رکھ لی جو صیغۂ انجینیرنگ سے متعلق تھی۔ اور اسی دن سے انجینیرنگ کا مطالعہ شروع کیا۔

انجینیرنگ کے پڑھنے میں ان کو ایک تو سید جعفر حسین سے دوسرے بلدیو کے کارخانے سے بہت مدد ملی۔ سامان عمارت اور فن تعمیر سے تو سید صاحب نے ان کو اکثر عمارتوں میں لے جا کے خوب واقف کرایا۔ فن نجاری اور آہنگری کے متعلق جو باتیں تھیں وہ کارخانے میں آنکھ سے دیکھیں۔

ہم ان کی سوانح عمری میں صرف اتنا لکھنا بھول گئے ہیں کہ بلدیو کے کارخانے سے جو ان کو خاص دلچسپی تھی اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے وہاں جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد لوہے کا کام سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک دن ان کی بیوی کے پاندان کے سروتے کی کیل ٹوٹ گئی۔ دوسرے دن

جو یہ مادھو کو پڑھانے گئے ہلاس لوہار کو سر و تا دیا کہ اس میں ذرا کیل ڈال دینا۔ اس نے لے کے رکھ لیا۔ جب پڑھا کے چلنے لگے تو اس کے پاس گئے۔ وہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔ بھول گیا۔ ان کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ ایک کیل وہاں پڑی ہوئی تھی اسے اٹھا کے اپنے ہاتھ سے کیل ڈالنا چاہا۔ کیل ڈال کے ہتوڑے سے سر کو چپٹا کرنے لگے۔ ہتھوڑی انگلی پر پڑ گئی۔ انگلی پچی ہو گئی۔ ہلاس نے جو یہ دیکھا، ہنسنے لگا۔ ان کے ہاتھ سے سر و تالے کے کیل ڈال دی۔ ایک تو ان کے چوٹ لگی۔ دوسرے کام نہ ہو سکا۔ تیسرے خفت ہوئی۔ خود فرماتے تھے کہ ہلاس کا یہ کہنا "میاں صاحب یہ پڑھنا نہ ہو۔ لوہے کا کام ہے آپ لوگوں سے نہیں ہو سکتا" اس وقت میرے دل پر اثر کر گیا۔ میں نے دل میں ارادہ کر لیا تھا۔ خدا چاہے تو اس کام کو سیکھ کے چھوڑوں۔ دو تین دن میں چپکا ہو رہا پھر اسی ہلاس کے پاس بیٹھنا شروع کیا۔ پہلے تو وہ کچھ دن ہنس کے ٹال دیا کرتا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ پیچھا نہیں چھوڑتے تو آخر بتانے لگا۔ چند ہی روز بعد میں نے اپنے گھر پر بھٹی بنائی۔ ایک دھونکنی مول لی۔ نخاس سے بہت سے اوزار خریدے۔ ریل کے دفتر سے میں چلا آتا تھا۔ ایک انگریز کے بنگلے پر نیلام ہو رہا تھا۔ بہت سے آدمی جمع تھے۔ میں نے اسی دن تنخواہ پائی تھی۔ میں بھی چلا گیا۔ یہاں سے ایک بکس کاٹ کباڑ کا خرید لیا۔ اس میں بہت سی ضروری چیزیں تھیں۔ بڑھئی کے اوزار پورے تھے کچھ لوہاری کے اوزار تھے۔ ایک فیتہ تانبے کا تھا۔ یہ بکس سوا دو روپے پر میرے نام پر چھوٹ گیا۔ پھر ایک سینے کی کل پر بولی ہوئی۔ یہ تین روپے کو مل گئی۔ ایک برف بنانے کی کل تھی۔ اس کا ایک پرزہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ڈیڑھ روپے کو وہ لے لی۔ گھر پر لا کے برف بنانے کی کل میں نے کھول ڈالی۔ ٹوٹے پہیے کو نکال کے ویسا ہی ایک پرزہ ڈھالنے کا سامان کیا۔ ڈھالنے کا

مسالا تیار کیا۔ پکی اینٹوں کی سُرخی چینی کے تکڑے یہ سب چیزیں مناسب مقدار سے لے کے کوٹ پیٹ کر ایک سفوف بنا لیا۔ اس میں تھوڑا تارپین کا تیل ملا لیا۔ پھر ایک سانچہ لوہے کا اپنے ہاتھ سے بنا لیا۔ پھر اسی ٹوٹے پرزے میں جو دندانہ ٹوٹ گیا تھا۔ ویسا مٹی کا بنا کے سکھا لیا۔ مسالا کو سانچہ میں ڈال کے داغ بنا لیا اور تھوڑا سا تیل لگا کے ویسا ہی پرزہ ڈھال لیا۔ پھر سوہن سے صاف کر کے کل میں جڑ دیا۔ وہ کل ابھی خاصی چلنے لگی۔ پھر پھندوں کو کھول کے سیاہ تاب کیا۔ بالٹی کا وارنش اڑ گیا تھا۔ اسے درست کیا۔ غرض کہ کل بالکل نئی ہو گئی۔ میاں حسین علی کے حوالے کی۔ انھوں نے سو اس میں دکھائی۔ دس روپے کو فروخت ہوئی۔ پھر سینے کی کل کے جو پرزے ٹوٹے ہوئے تھے انھیں بھی اپنے ہاتھ سے درست کر دیا۔ بیوی اس کل سے بہت خوش ہوئیں۔ میاں حسین علی کی بیوی محلہ بھر کے کام لے آتی تھیں۔ بیوی سیا کرتی تھیں۔ اس کام میں چکن کی ٹوپیوں سے زیادہ یافت تھی۔

اس کے بعد لکڑی کے کام پر مشق کرنا شروع کی۔ چند ہی دنوں میں گھڑونچیاں، تپائیاں، الماریاں، چوکیاں، تخت بنا بنا کے بیچنا شروع کیے۔ ریل کے دفتر سے جب نوکری چھوٹی تو اس سے روٹیاں چلتی رہیں۔ جو کچھ پس انداز ہوا اس میں ہاتھ نہیں لگایا۔ خدا نے ان کاموں میں ایسی برکت دی کہ انجینئری کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی دوگاہ والا مکان چھڑوا لیا۔ مگر وہاں سکونت نہیں اختیار کی۔ جس کنجڑے کے پاس رہن تھا اسی کو کرائے پر دے دیا۔ جس مکان میں اب سکونت تھی اسے مول لے لیا۔ برتن باسن خریدے۔ بیوی کے ہاتھ گلے میں کچھ زیور بھی ہو گیا۔ بیوی کے زیور میں مرزا عابد حسین کی کمائی کا ایک حبہ بھی صرف نہیں ہوا۔ وہ سب انھوں نے

سلائی کر کے بنوایا تھا۔
عابد حسین جس قدر محنت کرتے جاتے تھے اسی قدر محنت کی عادت بڑھتی جاتی تھی اور اس سے جو کامیابی ہوتی تھی اس سے شوق زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی محنت کا یہ نتیجہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان انجینیرنگ میں اول درجہ کی سند عطا ہوئی۔ اب کیا تھا گویا سرکاری ملازمت کی دستاویز ہاتھ آگئی۔ دو ہی تین مہینے کے بعد نوکر ہو گئے۔ ساٹھ روپیہ تنخواہ۔ پندرہ روپیہ بھتہ۔ پچھتر روپیہ ماہوار کی آمدنی ہوئی۔ محکمۂ تعمیرات میں ناجائز آمدنی کی بہت گنجایش ہے۔ مگر ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے دوست نے کبھی ایک حبہ سوائے تنخواہ کے نہیں لیا۔ شاید آپ کو یہ خیال ہوگا کہ مرزا صاحب نے ریلوے کے دفتر میں نوکر ہو جانے کے بعد بلدیوں کی نوکری چھوڑ دی ہوگی۔ نہیں چھوڑی۔ اور پھر گھر پر بھی کام کرتے تھے۔ بیوی علیحدہ کام کرتی تھیں جس سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ ان میاں بیوی کو ضرورت سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی ہوس تھی مگر اس کے ساتھ ہی ناجائز طریقے سے روپیہ پیدا کرنا ان کا شعار نہ تھا۔ انھوں نے جو کچھ پیدا کیا وہ اپنے قوتِ بازو سے پیدا کیا۔ اس سے ان کو سرکاری ملازمت میں رشوت خور اہلِ عملہ کی وجہ سے بعض موقعوں پر دشواریاں ہوئیں۔ جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ پہلے ہم اُن کے اُن اوصاف کا شمہ ذکر کرتے ہیں جن سے ان کے افسر، ان کی قدردانی کرنے لگے تھے جو اُن کی یوماً فیوماً ترقی کا باعث ہوا۔ ایک مرتبہ ان کے افسرِ اعلیٰ اکزیکٹیو انجینئر صاحب نے ایک منحرف پُل کی محراب کے قالب کا اسکیم بنا کے دیا اور حکم دیا کہ فوراً بڑھئی خانے سے ایک ایسا قالب بنوا دو پرسوں ہم دورے پر جانے والے ہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پورے قد کا

نقشہ تیار نہ تھا۔ اس لیے بڑھئی مستری کی سمجھ میں نہ آیا۔ اب اگر نقشہ تیار کیا جاتا ہے تو دیر ہوتی ہے۔ آخر انھوں نے قالب اپنے ہاتھ سے خود بنانا شروع کیا۔ آدھا بنا ہوگا کہ صاحب کارخانے میں معائنے کو آئے۔ دیکھا اور سیر صاحب خود ہاتھ میں بسولا لیے کام کر رہے ہیں۔ بڑھئی مستری صاحب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں صاحب نے اسی حال میں ان کو آ کے دیکھا۔ بہت ہی خوش ہوئے۔ اس دن سے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ اپنے ہاتھ سے کام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح لوہے کا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرتے ان کو دیکھ لیا۔ جب صاحب کی تبدیلی ہوئی تو ان کی سروس بک پر لکھا: "عابد حسین اپنا کام خوب جانتا ہے اور بڑھئی اور لوہار کے کام اپنے ہاتھ سے کر سکتا ہے۔ ہم اس کی ترقی کی سفارش کرتے ہیں۔" اس کی سفارش کا یہ نتیجہ تھا کہ اپنی ملازمت کے دو ہی سال کے اندر سب انجینیر ہو گئے۔

ایک مرتبہ ان کو قومی شجاعت دکھانے کا بھی موقع ملا۔ بات یہ ہوئی کہ سرحد افغانستان میں کچھ دنوں کے لیے ان کی تبدیلی ہو گئی تھی۔ ایک دن انجینیر صاحب کے ساتھ یہ ایک پہاڑ کے درّے میں پیمایش کو گئے تھے۔ وہاں دفعتاً چھ سات پٹھانوں نے آ کر گھیر لیا۔ خلاصی یہ معاملہ دیکھ کر رفوچکر ہو گئے۔ یہ اور صاحب اکیلے رہ گئے۔ صاحب نے کمر سے ریوالور نکالا۔ اتفاق سے گولی نہ چلی۔ اس پر افغانی اور دلیر ہو گئے۔ انھوں نے سینہ سپر ہو کر صاحب کی جان بچائی اور تلوار میان سے کھینچ کر بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ ان کے والد مرحوم اکثر فنون سپاہ گری میں مشاق تھے۔ انھوں نے لڑکپن میں کچھ اُن کو بھی سکھا دیا تھا۔ وہی اس دن ان کے کام آیا اور اسی دن ان کو قدیم فنون سپہ گری کی قدر ہوئی۔

اس واقعہ سے صاحب کے دل میں ان کی جگہ ہوگئی۔ سب ماتحتوں سے زیادہ ان کو مانتے تھے۔ چنانچہ ان کے سارٹیفکٹ میں بھی جو انھوں نے ولایت جاتے وقت ان کو بطور خود دیا تھا۔ اس میں اس واقعہ کا اشارہ کیا ہے۔

جس زمانے میں مرزا عابد حسین نہر کے محکمہ میں ملازم تھے، ایک رشوت خور ہیڈ کلرک سے عداوت ہوگئی۔ وجہ عداوت یہ تھی کہ دو گا ٹھیکیدار جس کے معرفت راجباہوں کی پلوں کی مرمت ہورہی تھی، دس روپیہ سیکڑہ اوورسیر صاحب کو دیتا تھا جس کی جگہ پر مرزا صاحب تشریف لے گئے تھے۔ اس میں اوورسیر اور ہیڈ کلرک میں نصفا نصفی کا حساب ہوجایا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھلا اس کو کب جائز رکھتے ہیں۔ انھوں نے ماہواری حساب پیمائش میں ایک انچ کی کسر نہ رکھی۔ ٹھیکیدار کی نانی مرگئی۔ اس صورت میں بھلا وہ کچھ کیوں دیتا مگر ہیڈ کلرک صاحب کو سخت نقصان ہوا۔ پہلے انھوں نے اشارتاً وکنایتاً مرزا صاحب سے کہا۔ یہ ایسی کب سنتے تھے۔ پھر صراحتاً بذریعہ سکنڈ کلرک کے کہلوایا کہ ہمارے معاملات میں دست اندازی نہ کیجیے۔ اس میں آپ کا بھی نفع ہے ہمارا بھی۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا نفع کیوں نہ ہو، سرکار کا تو نقصان ہے جو ہم کو پیش بہا درماہہ دیتی ہے۔ میں اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔ مجھ سے ایسی امید نہ رکھیں اور نہ دوبارہ اس بارے میں مجھ سے گفتگو کی جائے۔ یہ صاف جواب ہیڈ کلرک کو بہت ہی شاق ہوا۔ اب وہ صاحب کے کان ان کی طرف سے بھرنے لگا۔ کبھی کسی کام کے تاخیر ہونے کا الزام لگایا۔ کسی حساب کتاب میں کچھ شکوک پیدا کرکے صاحب کے گوش گذار کیے۔ بعض ٹھیکیداروں سے شکایت کرادی کہ مرزا صاحب کام نہیں دیکھتے۔ صاحب کے بیرا اور خانساماں ان سے پہلے ہی موافق تھے۔ ان سے وقتاً فوقتاً

کچھ کہلواتے رہے۔ پہلے تو ان امور پر صاحب کو اعتبار نہ ہوئی مگر کہاں تک کہنے سننے سے پہاڑ مل جاتے ہیں۔ آخر صاحب کو ان کی طرف سے سوءظن پیدا ہو گیا اور اس کے آثار باہمی خط و کتابت میں ظاہر ہونے لگے۔ مرزا ایسے بیوقوف نہ تھے جو اس معاملہ کو سمجھ نہ جاتے مگر بقول شیخ "آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک":

ایک مرتبہ پانچ میل کا لیول صاحب نے کیا تھا۔ اس کی جانچ کے واسطے مرزا صاحب کو بھیجا۔ مرزا صاحب نے پیمائش کی۔ کام کی عجلت تھی۔ اس لیے رڈیوسڈ لیول نکالنے کے لیے فیلڈ بک دفتر میں دیدی۔ یہاں ہیڈ کلرک صاحب نے فیلڈ بک غلط کر دی۔ جب رڈیوسڈ لیول نکال کے صاحب کی فیلڈ بک سے ملان ہوا۔ دس فیٹ کی غلطی ہو گئی۔ یہ وہ پیمائش ہے جس میں فی میل ۱/۲ انچ کی غلطی معاف ہے۔ یہاں دس فیٹ کی غلطی پانچ میل میں۔ صاحب نہایت ہی برہم ہوئے۔ ادھر مرزا صاحب اپنی جگہ پر نادم کہ غلطی اور اس قدر غلطی۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب نے بڑی ہوشیاری سے پیمائش کی تھی۔ ہر ایک گز کو دو دو مرتبہ پڑھا تھا بہت ہی متردد تھے۔ بیٹھے فیلڈ بک کے ہر ایک خانے کو جانچ رہے تھے۔ اکثر موقعوں کے گز ان کو یاد تھے۔ فیلڈ بک میں اس کے خلاف لکھا ہوا تھا۔ اب ان کو کچھ شک پیدا ہوا۔ میگ نی فائر (شیشۂ خورد بین) لگا کے جو دیکھتے ہیں مٹے ہوئے پنسلی داغ صاف پڑھ لیے گئے۔ وہ ان کی یاد کے مطابق تھے مگر اکثر جگہ میگنیفائر سے مٹے ہوئے نشان نہ پڑھے گئے۔ دوسرے دن پھر موقع پر پیمائش کرنے گئے پہلی مرتبہ لیول کرتے وقت ایک کاغذ پر رائز فال (نشیب و فراز) کا حساب کیا تھا۔ وہ کاغذ اتفاقاً ایک جگہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا مل گیا۔ مرزا صاحب اسی وقت اس کاغذ کو لیے گھوڑا دوڑا کے صاحب کے بنگلے پر

پہنچے اور حقیقتِ حال بیان کی۔ صاحب ہیڈ کلرک پر بہت مہربان تھے۔ مرزا کے کہنے سے کچھ شک تو ہو گیا مگر کسی قسم کا تدارک نہ کیا۔ اس سے بہت ہی بددل ہوئے اور اس دن سے دفتر والوں سے بہت ہوشیار رہنے لگے۔ دفتر والوں کا کوئی قابو نہ چلا مگر ان کی وجہ سے ان کا مالی نقصان ہوتا تھا۔ اس لیے یہ فکر تھی کہ کسی طرح ان کو نکلوانا چاہیے۔ آخر ایک ٹھیکیدار سے رشوت دہی کا اظہار صاحب کے سامنے دلوا دیا، اور اس سلیقہ سے مقدمہ بنایا کہ صاحب کو یقین آ گیا۔ صاحب نے مرزا کو معطل کیا اور مقدمہ فوجداری میں بھیج دیا۔ تحقیقات شروع ہو گئی۔ استغاثے کی طرف کے گواہ پورے ٹھیک اتر گئے۔ مرزا کے کونسل نے بہت زور دیا۔ جرح کے سوالات بہت ہی سخت کیے مگر ایک گواہ نہ ٹوٹا۔ مرزا پر چارج قائم ہو گیا۔ اب ڈیفنس کے گواہ گذرنے لگے۔ مرزا نے یہ عذر کیا کہ جس دن اور جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ میں پچاس میل کے فاصلہ پر خود انجینئر صاحب کے ساتھ پیمایش کر رہا تھا۔ انجینیر صاحب خود گواہی میں طلب ہوئے تھے مگر ہیڈ کلرک صاحب جعل سازی میں کامل تھے۔ انھوں نے پہلے ہی اس کا انتظام کر لیا تھا۔ صاحب کے دورے کی کتاب میں تاریخ بدل دی گئی۔ اگرچہ صاحب کو خود یاد تھا مگر تحریری شہادت کے مقابلہ میں زبان کیا کام دیتی۔ مرزا کا عذر نہ چل سکا۔ مرزا پر جرم عائد ہو گیا۔ جیل خانے جانے میں کوئی بات باقی نہ تھی۔ مرزا کے کونسل نے عذر مزید کے لیے مہلت مانگی۔ سشن جج نے نامنظور کی۔ اگرچہ مرزا کے چال چلن سے ایک زمانہ واقف تھا۔ خود اہل جوری مرزا کی بے گناہی کے معترف تھے مگر شہادتِ تحریری اور زبانی اس قدر ان کے خلاف تھی کہ کچھ کسی کے بنائے نہ بنتی تھی۔ کارروائی اس مقدمہ کی روزانہ اخباروں میں چھپتی تھی۔ اہلِ اخبار کی رائے بھی مرزا کے موافق تھی۔ از کہ تا مہ سب کو مرزا کی بے گناہی پر